تاب:**غلام عباس | تنقیدی مطالعہ اور منتخب افسانے**
تنقیدی مطالعہ و انتخاب: **محمد حمید شاہد**
ناشر: **بک کارنر جہلم**

اُن تخلیقی توفیقات کا اندازہ کیے بغیر جو غلام عباس(1909-1982) کے افسانے کو ماجرا نویسوں کو محبوب ہو جانے والی حقیقت نگاری سے مختلف اور نمایاں کرتے چلے گئے ہیں، اس باکمال افسانہ نگار کو ڈھنگ سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جی،میں غلام عباس کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے ۱۹۳۹ء میں ''آنندی'' لکھ کر ادبی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ سب حیرت سے اس افسانے کو دیکھتے تھے، اچھا یوں بھی افسانہ لکھا جا سکتا ہے، کہ اس کا کوئی ایک مرکزی کردار نہ ہو، کوئی ہیرو ہو نہ اینٹی ہیرو، سب کچھ منظر ہو کر یوں کا غذ پر اترے کہ وقت پہلو بدلنا بھول جائے۔ وہ جو اِن کے قلم کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نرم رو اور سبک سیر تھا تو اس کا سب سے کامیاب مظاہرہ اسی افسانے میں ہوا تھا۔ خود غلام عباس کو بھی یہ افسانہ لکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ایک مصنف کی حیثیت سے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا موڑ آچکا تھا۔ انہوں نے بہت پہلے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں، تراجم کیے اور ماخوذ کہانیاں بھی دیں، افسانے بھی لکھے مگر جب پہلی بار ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا تو اس کا نام ''آنندی''تھا؛ جی اس افسانے کے نام پر، جسے لکھ کر انہوں نے خود کو ایک تخلیق کار کے طور پر شناخت کیا اور جو ان کے فن کو عجب طرح کی توقیر دے گیا تھا۔ غلام عباس نے اس مجموعے کے بارے میں لکھ رکھا ہے: '' یہ افسانے میں نے دلّی میں ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے وقفوں میں لکھے۔'' یہیں انہوں نے یہ بھی بتایاہے کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے، مگراپنی تصنیفی زندگی کوایک خاص سال سے اہم سمجھنے کی وجہ کچھ اور نہیں '' آنندی '' جیسا شاہکار افسانہ ہے۔

عین آغاز ہی میں ''آنندی '' کا ذکر لے آیا ہوں تو اس کا سبب یہ ہے کہ غلام عباس کی تخلیقی شخصیت محض اس ایک افسانے کے منہا کرنے سے وہ رہتی ہی نہیں جو اِس افسانے کو تصور میں لاتے ہی بن جاتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غلام عباس کے پاس اور کامیاب افسانے نہیں ہیں۔ اوور کوٹ، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون، ہمسائے، کتبہ، اُس کی بیوی، بامبے والا، کن رس، دھنک ۔۔۔ پڑھتے جائیے اور مختلف لطف والا بیانیہ آپ کو زیادہ دُور نہیں جانے دے گا، باندھ کر کہانی کے آخر تک لے جائے گا۔ میں نے کئی ماجرانویسوں کو بڑی بڑی ہانکتے سنا ہے مگر انہیں پڑھ جائے تو شروع سے آخر تک انہیں کہانی کہتے ہوئے اپنے بیان کو تخلیقی بیانیے میں ڈھال لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بس واقعہ واقعہ اور واقعہ، جولکھنے والے کے اعصاب پر سوار رہتا ہے وہی وہ اپنے قاری کے اعصاب پر بھی سوار کر دیتے ہیں۔ غلام عباس کی حقیقت نگاری کی کوئی نسبت ایسے ہے توفیقوں سے ہے ہی نہیں۔ ذرا دیکھئے وہ پورے منظر کو اور پورے ماحول کو اپنے بیانیے میں کیسے مختلف کر رہے ہیں:

''یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا، گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے۔''(۱)

''وہ (بدلیاں) دُور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔''(۲)

''وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا جس طرح کوئی دُور دراز ملک کا رہنے والا منچلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کا ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے۔''(۳)

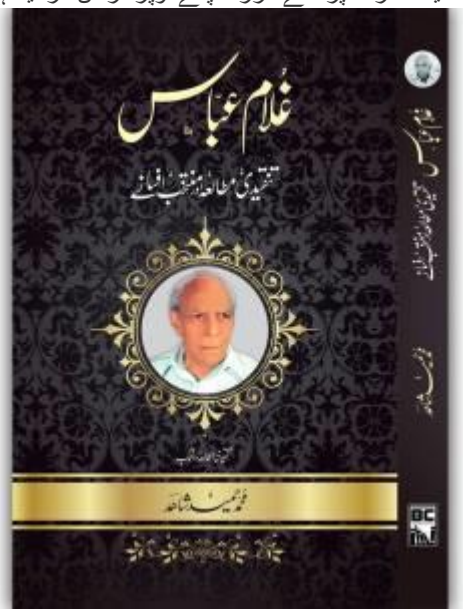

تو یوں ہے صاحب ، کہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنا اور اپنے تجربے کی تازگی، مشاہدے کی گہرائی اور انوکھے تخیل کو تخلیقی کٹھالی میں ڈال کر، پگھلا کر، ڈھال کر، سہار سہار کر لکھنا غلام عباس نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ چونکائے بغیر، واقعات میں اُتھل پتھل کیے بغیر، زندگی کو یوں لکھنا جیسی وہ تھی، مگر اُسے یوں لکھ دینا کہ عین مین ویسی نہ رہے جیسی وہ تھی۔

۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہونے والے غلام عباس کی زندگی کا وہ دورانیہ جو ۱۹۳۹ء سے پہلے کا تھا، ایک تخلیق کار کی حیثیت سے چاہے غلام عباس کے لیے اہم نہ ہو، ان کی تخلیقی زندگی میں بعد میں یوں ظاہر ہوا کہ ان کے فکشن کے لیے بہت اہم ہو گیا ہے۔ ابھی وہ شیر خوار تھے کہ ان کا باپ مر گیا۔ ماں نے دوسری شادی کی اور ابھی نو سال کے ہی تھے کہ ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ چار سال کے ہوئے تو

امرتسر سے لاہور آگئے۔ ماں نانی اور نانی کی بہن، یہیں بھاٹی گیٹ کے قریب ایک مکان میں رہے۔ کمانے والا کوئی نہ تھا، ماں نے پان سگریٹ اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان بنا لی، ذوق عمدہ تھا ناول وغیرہ پڑھتی رہتی تھیں۔ یہ پڑھنا غلام عباس نے ماں سے لیا۔ چھوٹی عمر میں ماں نے انہیں امام حسین علیہ السلام کا ملنگ بنا کر در در کا منگتا بھی بنایا تھا، اس سے ان کا مزاج بہت کچھ سہہ لینے پر قادر ہوا۔ نویں جماعت میں تھے کہ انگریزی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ کرنے لگے اور معاوضہ ملنے لگا، گویا ماں کے معاون ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقاتیں عبد الرحمن چغتائی ،ڈاکٹر تاثیر اور نیرنگ خیال والے حکیم یوسف حسن سے ہوئیں کہ وہ سب وہاں ایک پان والی دکان پر اکٹھے ہوتے تھے۔ نویں پاس نہ کر سکے تو سکول سے اُٹھوا لیا گیا۔ سوچا کیا کر سکتے ہیں، موسیقی سیکھنے کی طرف نکل گئے۔ بعد میں پڑھا بھی اور بہت کچھ حاصل بھی کیا مگر زندگی کا یہ دورانیہ ان کے افسانوں میں بار بار ظاہر ہواہے۔ یہ زمانہ بھی، اور وہ زمانہ بھی کہ جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے رسالے ''آواز'' کے ایڈیٹر تھے۔ اور ان کا دفتر پرانی دلّی کے علی پور روڈ پر واقع تھا اور گھر نئی دلّی کی ایک لین میں، یعنی شہر کے دوسرے سرے پر۔ تو جو کچھ اُن پر بیتا اور جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سہا اور جس کا اُنہوں نے تخیل باندھا وہ اُن کی زندگی سے کٹا ہوا نہیں تھا۔ مثلاً دیکھیے کہ تیس روپے ماہانہ کی ملازمت کا وہ تجربہ جو انہوں نے اسٹیشن کے مال گودام پر حاصل کیا تھا، ''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون'' اور'' چکر'' لکھتے ہوئے یاد آ جاتا ہے۔ ''تنکے کا سہارا'' لکھتے ہوئے وہ اپنے یتیم ہونے کے تجربے سے جڑ رہے ہوتے ہیں ،حتیٰ کہ ''آنندی'' اور ''سایہ'' میں پان والی دکان کو اس پان والی دکان سے الگ کرکے کیوں کر دیکھا جاسکتا ہے ، جس کا ذکر اُن کی ماں کے حوالے سے اوپر ہو چکا۔(۴)

دلّی میں قیام کا زمانہ تو ان کے کامیاب افسانوں کے ریشے ریشے میں بسا ہو ا دِکھتا ہے۔ بات ''آنندی'' سے شروع ہوئی تھی، تو اسی کا قصہ خود غلام عباس کی زبان سے سنیے۔ انہوں نے بتارکھا ہے کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہفتے پہلے، انہوں نے یہ افسانہ لکھا تھا۔ ان دنوں وہ دلّی میں تھے اور وہاں کے مشہور بازار چاوڑی کو طوائفوں سے خالی کرا کے انہیں شہر سے باہر دھکیل دیا گیا تھا۔ جس سڑک پر ان زنان بازاری کو منتقل کیا گیا وہ غیر آباد تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چوں کہ خالی زمین پڑی تھی، اس لیے دلّی کے شرفا کے لیے کم'' خلل رساں '' سمجھ کر میونسپل کمیٹی نے اسے طوائفوں کو الاٹ کر دیا گیا تھا۔ غلام عباس دفتر آتے جاتے وہاں سے گزرتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ پہلے پہل تو ہفتوں زمین ویسے ہی بے آباد پڑی رہی پھر اس نے انگڑائی لی راج مزدور آگئے اور جوش تعمیر جنوں کی حدوں کو چھونے لگا۔ یہی تجربہ 'آنندی' میں ہے مگر محض یہ مشاہدہ اس افسانے میں نہیں اور بھی بہت کچھ ہے ، ایسا کہ جسے شاید سہولت سے بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے کاآغاز بلدیہ کے اجلاس کی کارروائی کی رپورٹنگ سے ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں زندگی کے مختلف شعبوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے زنان بازاری کو شہر بدر کیے جانے کے حق میں اپنے اپنے دلائل دے رہے ہیں۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ یہیں بیانیہ ہم پر بازار کی تجارتی اہمیت اُجاگر کرتا ہے اور مختلف سطحوں پر اس بازار کے عام زندگی میں دخیل ہونے کی صورتوں کو سامنے لاتا ہے۔افسانہ ہمیں باور کرا دیتا ہے کہ نئی زندگی کے مرکز میں بازار ہے۔ اسی سے نہ صرف سب مردوں کو، ان کی بہو بیٹیوں کو بھی گزرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں جاری بحث کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ شریف زادیاں جب آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کا بناؤ سنگھار دیکھتی ہیں تو غریب شوہروں سے فرمائشیں کرتی ہیں۔ طبلے کی تھاپ سے زندگی کا وہ بے ہنگم پن خطرے میں پڑ جاتا ہے، جس کے وہ عادی ہیں۔ یہیں ایک پنشن یافتہ معمر رُکن کی آواز بھراتے دکھایا گیا ہے جس کا مکان بازار کے وسط میں تھا، اور کسی رُکن سے یہ سوال بھی پچھوا لیا گیا ہے کہ آخر یہ طوائفیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ اس کا جواب سماج کی طرف سے فقط ایک قہقہہ ہے۔ جی، یہ افسانے میں بتا دیا گیا ہے۔(۵)

بتا چکا ہوں کہ افسانے میں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو غلام عباس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بازاری عورتوں کے مکانات خرید کر اُنہیں شہر سے چھ کوس باہر ایک ویرانہ الاٹ کر دیا جانا۔ غلام عباس کا قلم یہاں جادو دکھاتا ہے اور زندگی کی تفہیم کرتے ہوئے، جنس کو زندگی کے عین وسط میں متعین کر دیتا ہے حتیٰ کہ ادبدا کر پھر سے آدمی اس جنس کو آلائش سمجھتے ہوئے اپنی زندگی، کہہ لیجئے سو کالڈ پاکیزہ زندگی سے کاٹ کر دُور پھینکنے کے جتن کرنے لگتا ہے۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے آج کے کارپوریٹ اداروں کی بالادستی کے عہد میں عورت کا پراڈکٹ بن جانا بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگر افسانہ یہ بتا رہا ہے کہ پانسو بیسواؤں میں سے چودہ ایسی تھی کہ خوب مالدار تھیں اور انہوں نے مکانات بنوانا شروع کر دیے تھے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان بیسواؤں کو کس کی سرپرستی حاصل تھی، گویا سرمایہ بیسوؤں پر سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ اچھا یہ بھی دیکھئے کہ تعمیر کو مزدور، معمار تو آنے ہی تھے مگر حیران کن سلیقے سے غلام عباس نے بتایا ہے کہ وہاں سب سے پہلے اللہ کا نام بلند ہوا۔ حُسن آباد ، جسے بعد میں حسن آباد کا نام دینے کی کوشش کی گئی اور جس کا سرکاری نام ''آنندی'' ہوا، اس میں ایک جگہ پر مسجد کے آثار تلاش کر لیے گئے، کنواں بحال ہوا، مسجد بن گئی تو اذان بھی دی گئی۔ ایک امام کی ضرورت تھی کسی گاؤں کا ملا وہاں پہنچ گیا۔ ایک ٹوٹاپھوٹا مزار بھی وہاں مل گیا تھا۔ اس کی پھوٹی قسمت جاگ اٹھی، ایک لمبا تڑنگا مست فقیر آگیا، پیر کڑک شاہ کی جلالی کرامات کا ذکر ہو نے لگا۔ گویا اللہ کے نام پر حُسن آباد ، آباد ہو رہا تھا۔ ایک بڑھیا ایک لڑکے کے ساتھ مسجد کے قریب ایک درخت تلے گھٹیا سگریٹ، بیڑی چنے اور گڑ کی مٹھایوں کا ٹھیلا لگا کر بیٹھ گئی۔ مذہبی وسائل ، عورت اور پسا ہوئے سماج کے کارکن، سب ہی بازار کی بھٹی کا ایندھن بننے لگے۔ بوڑھا شربت لگا کر بیٹھ گیا، سری پائے والا آیا اور خربوزے وا لابھی۔ خوانچے والا کبابی، تندور والا، شہر کے شوقین، لچے لفنگے سب وہاں پہنچ گئے۔ رونق بڑھتی گئی، چھ مہینے میں چودہ مکان بن گئے، ہر مکان کے نیچے چار چار دکانیں، بدھ کو نیاز دلوائی گئی، دیگیں پکیں، شامیانے کرسیاں لگیں اور نیا شہر بس گیا، بیسوائیں، بناؤ سنگھار رقص و سرود، ناز نخرے، شراب کی بوتلیں۔ دکانوں پر کرائے دار آگئے۔ پہلے تھریٹکل کمپنی نے تمبو لگائے پھر وہاں سینما بنا، ڈاکخانہ، بینک، اسکول، ریلوے اسٹیشن، جیل، کچہری۔ تو یہ ہے وہ سارا ہنگامہ جو غلام عباس نے اس افسانے میں دکھایا ہے(۶) اور اسی سے یہ نکتہ بھی بہت سلیقے سے سجھا دیا ہے کہ زندگی کو اسی دائرے میں گھومنا ہوتا ہے اوراسی دائرے میں گھو متے رہے گی۔

آپ نے دیکھا کہ اس افسانے میں پورا سماج کہانی کا کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں، اس کا امکان رہتا ہے کہ پڑھنے والا تفصیلات سے اُکتا کر اس سے الگ ہو جائے۔ اس کا احساس غلام عباس کو تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی جزیات نگاری میں ایسے ایسے پہلو رکھ دیے ہیں کہ بیانیہ توجہ کھینچے رکھتا ہے۔ ایسا ہی قرینہ غلام عباس کے ایک اور افسانے ''کتبہ''(۷) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شہر سے باہر ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ یوں دکھایا جاتا ہے، جیسے کسی ڈرامے کا لانگ شارٹ لیا جا رہا ہو۔ گرمی کے زمانے کا منظرنامہ پوری طرح نگاہوں میں گھوم جاتا ہے اور ہم کھلی آنکھ سے کلرکوں، ٹائپسٹوں، ریکارڈ کیپروں، اکاونٹنٹوں، ہیڈ کلرکوں، سپریٹنڈنٹوں

غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجے کے کلرکوں کو سیلاب کی صورت ایک بڑی سی سڑک پر اُمنڈتا دیکھ سکتے ہیں۔ اسی میں سے کہانی کا مرکزی کردار چپکے سے برامد ہو کر اپنی شناخت مکمل کرتا ہے۔ جی اس سیلاب سے ایک چھینٹ کی صورت الگ ہونے والا کردار درجہ دوم کا کلرک شریف حسین۔ وہ ایک تانگے میں سواری کی گنجائش دیکھ کر لپک کر اس میں سوار ہوتا ہے۔ شہر کی جامع مسجد کی ا طراف میں لگا کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کا بازار اس کی منزل ہے۔ اسے وہاں سے کچھ خریدنا نہیں ہے، اس کی بیوی بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی ہے۔ پانچ کا نوٹ اور کچھ آنے اس کی جیب میں بچے ہوئے اور وقت گزاری کے لیے یہی اُسے بازار میں لے آئے ہیں۔ غلام عباس محض ایک دو کرداروں سے کہانی نہیں بنتے وہ تو زندگی کا سارا ہنگامہ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی کباڑیوں کی دکانوں کا منظر، بیٹریاں، گرامو فون کے کل پرزے، آلات جراہی، ستار، بھس بھرا ہرن، بدھ کا نیم قد مجسمہ، سب اِسی زندگی کے مظاہر ہیں۔ یہیں ایک دکان پر سنگ مر مر کے ٹکڑوں پر درجہ دوم کے کلرک کی نظر پڑتی ہے اور اس کی زندگی میں اول درجے کے خواب داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسے خواب ہیں جو اُسے پچھاڑ کر رَکھ دیتے ہیں۔ صارفی نفسیات کے تحت درجہ دوم کاآدمی اول درجے کے نام نہاد خواب کس جھانسے میں آکر بلا ضرورت خرید لیا کرتا ہے، اسے سمجھنے کے لیے افسانے کا وہ حصہ پڑھیے جس میں مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑے ہوئے، سوا فٹ ایک فٹ کے ٹکڑے کو شریف حسین دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ نفاست سے تراشے ہوئے اس مر مر کے ٹکڑے کی قیمت محض تین روپے ہے۔ قیمت مناسب تھی کہ اُس کی جیب میں پانچ روپے اور کچھ آنے تھے مگر وہ رکھ کر چل دیا کہ اس کی ضرورت کی چیز نہ تھی۔ مارکیٹ اپنے شکار کو اپنے شکنجے سے نکلنے نہیں دیتی، اس اکانومی کی بنیاد یہی ہے کہ اپنے صارف کی ضرورتوں کا تعین، صارف کے ہاتھ سے چھین کراپنے ہاتھ میں لے لے، تو یہ اصول یہاں کام کر رہا تھا۔ شریف حسین نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا ''ہم ایک روپیہ دیں گے۔'' جواب آیا ''سوا بھی نہیں '' اور اس سے پہلے کہ گاہک نکل جاتا مارکیٹ کا فیصلہ آگیا ''لے جائیے۔'' تو یوں ہے کہ شریف حسین کی ضرورت کا تعین مارکیٹ نے کر دیا تھا اور وہ ایسا پتھر لے کر گھر آگیا، جس کی اُسے ضرورت نہ تھی، مگر اب اس کی زندگی میں اوّل درجے کا خواب بن کر دخیل ہو گیاتھا۔ سنگِ مرمر پر شریف حسین نے اپنا نام کندہ کروایا اور رات کھلے آسمان تلے لیٹ کر ایسے ذاتی مکان کے خواب دیکھے جس کے صدر دروازے پر یہی نام والا کتبہ نصب ہونا تھا، مگر ہوا یہ کہ وہ مر گیا اور اُس کی قبر پر یہ کتبہ لگا۔

یاد رہے کہ دلّی میں سرکاری ملازمین کے کوارٹروں میں غلام عباس رہا کرتے تھے اور اس افسانے کے آغاز کا منظر وہیں کا ہے۔ یہ کوارٹر کناٹ پیلس نئی دلی کے نواح میں گورنمنٹ نے بنوائے تھے اور بقول غلام عباس، ایک مرتبہ وہ مولا چراغ حسن حسرت کے ساتھ تانگے پرحوض قاضی سے فتح پوری جا رہے تھے کہ اُنہیں ایک سنگ تراش کی دکان پر ایک پتھر نظر آیا جس پر بس ایک نام لکھا ہوا تھا۔ اسی سے اُنہیں لکھنے کا یہ خیال سوجھا تھا۔ اس خیال کو انہوں نے محض سادہ سی کہانی میں نہیں رکھا ، ایک افسانے میں ڈھال کر ہمیں زندگی کی گہری معنویت بھی سجھا دی ہے، ایسی معنویت جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور گہری ہوتی جارہی ہے۔

غلام عباس کے معروف افسانوں کے حوالے سے کہا جاتا رہا ہے کہ اُن کے بنیادی خیال ماخوذ تھے۔ خود غلام عباس چوں کہ تراجم کرتے سے علمی ادبی حلقوں میں توجہ Tales frrom Alhamra اور واشنگٹن ارونگ کے The Long Exile رہے ، اس باب میں ٹالسٹائی کے بھی پائی(۸)۔ پھر وہ کچھ افسانوں کے بارے میں، خود بھی کہاکرتے تھے کہ وہ ماخوذ ہیں، جیسے'' جزیراں سخنواراں''(۹)۔ یوں ان افسانوں کے بارے میں دُھند بڑھتی چلی گئی۔ غلام عباس نے اپنے بیانات میں اس دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن مقامات کو نشان زد کیا ہے ، جہاں سے انہیں یہ افسانے سوجھے۔ ایسے ہی افسانوں میں سے ایک ''اوور کوٹ '' ہے۔ آصف فرخی کو انٹرویو دیتے ہوئے غلام عباس نے بتایا تھاکہ ایک دفعہ وہ تاثیر، فیض اورپطرس کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلے اور وہ بھی یوں کہ جلدی میں شب خوابی کے لباس پر اوور کوٹ پہن لیا اور معقول صورت نظر آنے کے لیے گلے میں گلو بند لپیٹ لیا۔ پطرس گاڑی چلا رہے تھے اور باتوں باتوں ایسی گرم جوشی پیدا ہوئی کہ سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ بس اسی سے انہوں سے سوچا تھا کہ اگر ٹکر ہو گئی ہوتی اور ہسپتال جاکر اُن کا اوور کوٹ اُتارا جاتا توکیا ہوتا(۱۰)۔ خیر معاملہ کوئی بھی ہو میرے لیے افسانہ ''اوورکوٹ''(۱۱)محض ایک واقعہ نہیں

رہا، زندگی کرنے کے ایک قرینے کی علامت ہو گیا ہے۔ خوش پوش نوجوان کی جگہ ہم اپنے اپنے آپ کو رکھ کر دیکھیں ، تو میری بات پوری طرح واضح ہو تی چلی جائے گی۔ غلام عباس نے بھی اس نوجوان کا پہلے لانگ شارٹ لیا ہے ، اور پھر اس پر فوکس کرتے گئے ہیں ؛ یوں کہ منظر نامہ کہانی سے کہیں بھی منہا نہیں ہوتا۔ کہانی کو علامت بنانے کا یہ قرینہ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں لکھنے والوں کی دسترس سے دور رہا حالاں کہ غلام عباس اس بابت بہت کچھ سجھا گئے تھے۔ پلاٹ ،کردار، منظر ، ماحول اور کہانی کسی بھی عنصر کی تخفیف کے بغیر ایک علامتی کہانی لکھ دینا ممکن تھا اور ممکن ہے۔ میں نے اس افسانے سے یہی سیکھا ہے۔ بادامی رنگ کا اوور کوٹ ، کاج میں شربتی رنگ کا گلاب کا پھول ، سر پرسبز ہیٹ، سفید سلک کا گلو بند اور چال میں بانکپن؛ یہ ہے مرکزی کردار۔ یہاں کردار کا نام نہیں بتایا گیا ہے ، جیسا کہ بعد میں کردار وں کو بے نام رکھنے کا چلن ہوا ، مگرلطف یہ ہے کہ اس کردار کی شناخت قائم کی گئی ہے۔اس کا طبقہ اور اس کے خواب ، اس کی حسرتیں اور تمنائیں سب ہم پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ٹیوس روڈ سے مال پر اور وہاں سے چیرنگ کراس، ہاتھ میں چھڑی جسے بعد میں اس کے وجود سے الگ ہو جانا ہے ، ٹیکسی والے کا رُکنا اور اس کا ’’نو تھینک یو‘‘، کہہ کر آگے نکل جانا ، ادھ کھلا پھول تھوڑا سااُچھل کر کوٹ کے کاج سے باہر کیوں نکل آیا تھا ، اور اسے واپس کاج میں جماتے ہوئے نوجوان کے ہونٹوں پر خفیف سی اور پر اسرار سی مسکراہٹ کیوں پھیل گئی تھی ، اس سب کے کچھ معنی ہیں ، مگر غلام عباس نے ایک ایک سطر کے معنی بعد میں ظاہر کرنے کے لیے سینت سینت کر متن کے اندر چھپا کر رکھ دیے ہیں۔افسانہ ایک اور جست بھرتا ہے ، ایک اور نوجوان، اپنی فربہی جسم والی دوست لڑکی کے ساتھ اسی کھلے منظر نامے میں داخل ہوتا ہے ، جو اپنی دوست کو سمجھا رہا ہے کہ وہ فکر نہ کرے ڈاکٹر اُس کا دوست ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

زندگی میں سب کچھ ٹھیک کہاں ہوتا ہے۔ غلام عباس نے اپنے اس افسانے میں یہی بتایا ہے اور یہ بھی کہ ہم ہر لمحے اپنے اندر کے عذاب اوراپنی غلاظتیں چھپانے کے جتن کرتے رہتے ہیں ، مگر وہ چھپتے نہیں ہیں۔ ہم اس حقیقت کو بھول کر آگے بڑھتے ہیں اور اگلا لمحہ ہمارے باطن کو اندوھا کر سامنے رکھ دیتا ہے؛ یوں جیسے اس مست اور چنچل لڑکے کو کچل ڈالنے والے ٹرک کے زن سے گزر جانے اورشدید زخمی لڑکے کے ہسپتال میں آپریشن تھیٹر پر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے۔ باہر سے خوشنما ریپر میں لپٹی ہو ئی زندگی کا اصل چہرہ یہی ہے جو ہم اسے وقفے وقفے سے چونک چونک کر دیکھنے پر مجبور ہیں۔ بہ ظاہر اس کہانی کا منظر نامہ قدیم ہے مگر اپنی معنویت کے اعتبار سے یہ آج کی کی کہانی ہے۔

ایسا ہی ہم ’’فینسی ہیئر کٹنگ سیلون‘‘(۱۲) کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔بلکہ یہ تو آج کے اس وزیر خزانہ کی کہانی لگتی ہے ، جس کے گھر سے حکومتی خزانہ برآمد ہو گیا تھااور اس حکومتی سربراہ کی بھی جو ہمیں خواب دکھا کر اپنی سرمایہ کاری کا حجم بڑھائے چلا جاتا ہے۔ غلام عباس نے ایسا کیا ہے کہ تقسیم کے بعد کے زمانے میں، ایک چھوٹی سی چائے کی دکان پرچار حجاموں کو اکٹھاکر دیا ہے۔انہیں ایک ہیئر کٹنگ سیلون الاٹ کروادیا، جو تقسیم سے پہلے چالو تھا ، مگر مالک کے ادھر چلے جانے کی وجہ سے اب اجڑا پڑا ہے۔ پھر چاروں کے بیچ ایک خستہ ہال منشی لا بٹھایا۔ یہ چالاک منشی آج کی سیاست کا مرکزی کردار ہو گیا ہے۔ تو یوں ہے کہ ہم اسی منشی کے رحم و کرم پر ہیں۔

لیجئے صاحب اب ایک قدرے مختلف افسانہ۔ جی ،میں غلام عباس کے افسانے’’ ہمسائے‘‘ (۱۳)کا ذکر کرنے جا رہا ہوں۔ اگرچہ اس افسانے کا بیانیہ بھی دھیما ہے مگر ہر منظر قاری پر یوں کھلتا ہے جیسے ہر منظر کو الگ سے فلما کر ، اور اس کے فالتو حصے کاٹ کرباہم جوڑ لیا گیا ہو۔ منظر ایک پہاڑی پر کھلتا ہے ، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں پہاڑی کی ڈھال پر ایک الگ تھلگ مکان ہے۔ جس طرح میں بیان کر رہا ہوں وہاں منظر منظر اس طرح لکھا ہوا نہیں ہے ، بس پڑھتے ہوئے جو ذہن کے پردے پر تصویر بنتی ہے ، اس کی ترتیب لگ بھگ ایسی ہی ہے۔ اس مکان کو لکڑی کی پتلی سی دیوار سے دوگھر وں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ کہانی ان گھروں میں بسنے والے دو الگ خاندانوں کی نہیں ایک بچے کی ہے جس کا دِل محبت کی خوشبوسے مہک رہا ہے۔ گرمی کا زمانہ، لکڑی کا لمبا سا زینہ، بے توجہی کی شکارپھلواڑی کااکیلا پھول،نیلی دھند میں بسا منظر، جیسے پانی میں عکس اور پھر اس منظر کا بدل جانا۔ اسی سے کہانی کا مزاج بدلتا ہے۔ آٹھ نو برس کا اکبراپنے گھر سے نکلتے ہی کہانی کے منظر نامے کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اس کا بے اختیارساتھ والے گھر کو یوں دیکھنا ، جیسے وہ مٹھائی یا کھلونوں کی ایسی دکان ہو جو دکاندار اپنی کا ہلی کی وجہ سے وقت پرنہیں کھول پاتا۔ پھول توڑنا، اور ساتھ والے دروازے تک جانا ، جھجک کر پھول پیچھے چھپانا ، پھر بے دھیانی میں اس کی ایک پتی نوچ لینا ، پھر جانتے بوجھتے ایک ایک پتی نوچتے چلے جانا،یہ سب اس کے دل کی تصویریں ہیں۔ مگر یہ تصویریں یوں بدلتی ہیں جیسے اس پہاڑی مقام کا موسم ، کبھی بادل پیازی رنگ کے ہو جاتے ہیں ، کبھی پھوار بر سنے لگتی ہے۔ ابھی ابھی دور اس سکول کا منظر صاف نظر آرہا تھا جو گرجا گھرجیسا تھا ، سکول بھی اور وہ مکان بھی جس کی انگنائی میں ایک عورت دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر پھیلارہی تھی ،کہانی کے آخر میں پہنچ کر کچھ بھی نظر نہیں آتا زمین اورآسمان پر ایک سیاہ چادر تن جاتی ہے۔ سب کچھ اس میں لپٹنے لگتا ہے، انسان، حیوان ،شجر،حجر ، اور اکبر بھی۔ صرف ننھے اکبر کا جسم نہیں اُس کی روح کو بھی۔ تو یوں ہے کہ غلام عباس نے اس کہانی کا بیانیہ اتنا پرلطف بنا دیا ہے کہ وہ ہماری روح سے کلام کرنے لگتا ہے۔

غلام عباس نے افسانوں کے تین مجموعے دیے(۱۴)، ان میں موجود ہر افسانے پر بات ہونی چاہیے مگر اس نشست میں ایسا ممکن نہیں ہے لہٰذا مجھے کہیں اپنی بات روک دینی ہے ؛ یہیں روک سکتا ہوں مگر میرا دھیان محمدحسن عسکری کے ایک خط کی طرف چلا گیا ہے جو ۳۰اکتوبر ۱۹۴۸ کواُنہوں نے غلام عباس کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں عسکری نے جو لکھا اُنہی کے لفظوں میں مقتبس کر رہا ہوں:

’’ آپ نے ’’اردو ادب‘‘ کو جو افسانہ دیا ہے وہ منٹو کو بہت پسند آیا ہے۔ وہ تو ایک دن یہاں تک کہنے لگے کہ بس عسکری صاحب میں تو افسانہ نگار ہوں ہی نہیں، اس افسانے کے سامنے میرا افسانہ’’کالی شلوار‘‘ بکواس ہے۔ غرض وہ آپ کے افسانے کی اکثر تعریف کرتے رہتے ہیں ‘‘(۱۵)

کیا منٹو نے واقعی ایسا کہا ہوگا ، یقین نہیں آتا مگر منٹو نے ۳ نومبر ۱۹۴۸ کو غلام عباس کو اپنے خط میں جو لکھا اُس کایقین کرنا ہی پڑے گا کہ یہ راست حوالہ ہے۔ منٹو نے لکھا تھا:

’’تمہارا افسانہ’’دوسری بیوی‘‘ (شایدعنوان کچھ اور ہے)خوب تھا۔‘‘(۱۶)

اور یہ بھی اضافہ کیا تھا:

’’تمہارے قریب قریب سارے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں۔‘‘(۱۷)

منٹو کا خدشہ درست تھا ، انہیں افسانے کادرست نام یاد نہ رہا تھا۔ جسے وہ ''دوسری بیوی'' لکھ گئے وہ ہو نہ ہو افسانہ ''اُس کی بیوی'' (۱۸)تھا۔ غلام عباس نے اِسی قبیل کا ایک اور افسانہ بھی لکھا تھا؛''سمجھوتہ''(۱۹) ،وہی جس میں بھاگ جانے والی بیوی کے ایک روز خستہ حالت میں واپس آنے کو غلام عباس نے ایسے لفظوں میں لکھا کہ پڑھتے ہوئے مجھے ابکائی آ گئی تھی۔ انہی کے الفاظ مقتبس کرتا ہوں:

'' جیسے کتیا کیچڑ میں دوسرے کتوں کے ساتھ لوٹ لگا کر آئی ہو۔''(۲۰)

مجھے یہ جملہ پڑھ کر شدید دکھ ہوا تھا۔ یہ جملہ اوراس سے بھی ایک اور شدید جملہ جو اسی افسانے میں پہلے پڑھ آیا تھا ، جی وہی، جس میں اسی کردار سے کہلوایا گیا ہے کہ:

''عورت کے معاملے پر سنجیدگی سے غور حماقت ہے۔''(۲۱)

یہ ایسے جملے ہیں جو مجھے غلام عباس کے اس افسانے سے پرے دھکیل دیتے ہیں حالاں کہ ایسا سوچنے والا، جو اس کہانی کا مرکزی کردار بھی ہے، خودجنسی کیچڑ میں لوٹ لگانے کے بعد واپس اپنی بیوی کے پاس لوٹ آتا ہے، اُسی بیوی کے پاس جو اس کی نظر میں باعصمت نہیں تھی۔ خیر ، منٹو بھی اس افسانے کو کیسے پسند کر سکتے ہیں تاہم مجھے یقین ہے جس افسانے کو منٹو نے پسند کیا ہو گا، وہ ''اُ س کی بیوی'' ہی ہوگا۔ صاحب ،عجیب و غریب کہانی ہے یہ ، ایک نوجوان، نسرین نامی طوائف کے کوٹھے پر موجود ہے اور بات بے بات اپنی مرحومہ بیوی نجمہ کو یا د کر رہا ہے۔نسرین کے چہرے پر خفیف سا اضمحلال ہے اور وہ سوچ رہی ہے کہ کیسا مرد ہے جس کے پاس اپنی مرحومہ بیوی کے سوا کوئی اور موضوع ہی نہیں ہے۔ افسانے سہج سہج آگے بڑھتا ہے اور اس افسانے میں بیوی کا کردار نبھانے والی عورت بھی افسانہ'' سمجھوتہ ''والی بیوی کی طرح بے وفا نکلتی ہے مگر پڑھتے ہوئے کہیں اُکتاہٹ نہیں ہوتی ، حتی کہ خریدے گئے بچے کھچے وقت میں پڑنے والی رات کے پچھلے پہر اچانک اپنی بے وفا بیوی کو یاد کرنے والا نوجوان سوتے میں سبکی لیتا ہے اورایک طوائف اسے چھاتی سے یوں چمٹا لیتی ہے جیسے کوئی بچہ سوتے میں ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیا کرتی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر مجھے دہرا لینے دیجئے کہ غلام عباس کی اُن تخلیقی توفیقات کا اندازہ کیے بغیرجواُن کے افسانے کوسیدھی سادی کہانی سے مختلف کر دِیتی ہے ، اُن کی حقیقت نگاری کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ زمان کے بہاؤ میں رخنے ڈالے بغیر ایسے قرینے سے کہانی لکھنا کہ اس کی جزیات میں جادو بھرتا چلا جائے، یہ غلام عباس کی توفیقات کا ایسا علاقہ ہے جس نے اُنہیں اپنے ہم عصروں میں مختلف کیا اور ممتاز بھی اور یہی سادہ مگر جادو بھرا قرینہ ہے کہ جس کے سبب غلام عباس اردو افسانے کا ایک مستقل باب ہو گئے ہیں